باب ۸

عاشق اور عارف

دل سرا پردۂ محبت اُوست　　دیدہ آئینہ دارِ طلعتِ اُوست
ہرگلِ نوکہ شد چمن آراء　　اثرِ رنگ و بوئے صحبتِ اُوست

حافظؒ

ہر دل اسی کی محبت کا پردہ دار بنا ہے۔ ہر آنکھ اس کی صورت کی آئینہ دار بنی ہے۔ ہر نوزائدہ کلی اسی کی صحبت کا اثر لئے ہے۔

عشقِ حقیقی و مجازی

عشق ہی جذبہ اولیں ہے۔ اسی کو ''جذبۃٌ مِنْ جذباتِ الْحق'' کہا ہے۔ ساری کائنات ''اَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ'' اس پہچانے جانے کے شوق کا ظہور ہے۔ تجسّس، طلب، شوق، کشش، نمو، حیات، ایک جذبہ کن کے تحت کائنات کی رنگینی بنے ہیں۔ انسان، ''اَحْسَنُ التَّقْوِیْم'' میں جو روح پھونکی گئی وہ اسی جذبہ عشق کے جذبۂ اوّلیں کی شدت کے لیے طرح طرح سے جلوہ نمائی کر رہی ہے۔ عشق کا ایک رخ وہ جذبہ رحمت ہے جس نے اپنی لامتناہی وسعتوں میں خلقت کو ڈھانپ رکھا ہے۔ انسان کیا، اس کی بساط کیا۔ مگر وہ جس نے ربوبیت، ستاری و غفاری کے جذبہ کی شدت پائی وہ ہی کہیں عشق و رحمت کی جھلک پا سکتا ہے اور وہ ہی اس رحمت بے کراں کی وسعتوں، بے قراریوں، بے تابیوں کا اندازہ کر سکتا ہے جو رئوف الرحیمی اور حَرِیْصٌ عَلَیْکُم کی رحمت للعالمینی میں ہمارا احاطہ کئے ہے۔ اس رحمتِ عالم کو کوئی تخیل میں بھی کیسے لائے۔ رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ

شَیْءٍ البتہ اپنے ہی اندر جھانک کر کچھ اس رحمت سے شناسائی ہوسکتی ہے۔ یہ اپنی بے تابیاں، بے قراریاں، یہ ایک نامعلوم ہیجان اپنے اندر کیوں ہے۔ یہ کسی حسین آئینہ میں ایک جھلک مل کر، اپنی آنکھوں کو ٹھنڈک کیوں نصیب ہوتی ہے۔ اور جب بھی کائنات عالم میں کہیں بوئے محبوب، کہیں عشق کی نشانی ملتی ہے تو اندر کی رگ رگ اس جذبہ عشق و ربوبیت کی تصدیق میں کیوں ہم نوا ہو جاتی ہے۔ غالباً یہ ادائے ہم آہنگی، یہ حُرمتِ پردہ داری اسی ربوبیت کے طفیل ہے جس کا ظہور رحمتِ عالم بن کر چھایا ہے۔ اسی اثرِ رنگ و بو کا تقاضا ہے کہ اگر ماں سے پوچھو کہ اس کی اولاد میں سے کون اچھا ہے کون برا، تو سب سے زیادہ حقیر، ناکارہ اور ناسپاس اولاد پر بھی جان قربان کر دینے کو تیار ہو جاتی ہے۔ جب مجازی جذبہ ربوبیت یعنی ظلِ ربوبیت کی اتنی شدت ہے تو پھر ربوبیتِ شیخ اور ربوبیتِ رَحْمَتَ لِلّعالمینی کی کیا انتہا ہوسکتی ہے۔ یہاں تو خود ربوبیت حق جلوہ گر ہے۔

ماں کی ممتا، ماں کے جذبۂ ربوبیت کی رونمائی کے لیے ایک واقعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ کہتے ہیں کہ ایک ماں اور اس کی صرف ایک اولاد لڑکا، ایک دوسرے پر جان فدا کرتے زندگی گزار رہے تھے۔ لڑکا نوجوانی پر پہنچا تو ایک رلیہ کی لڑکی پر فدا ہوگیا۔ لڑکی کو اس لڑکے سے کوئی دلچسپی نہ تھی مگر لڑکے کی بگڑتی حالت پر ترس آیا۔ سمجھانے بجھانے سے کام نہ بنا تو پیچھا چھڑانے کے لیے لڑکے سے کہا کہ اپنی ماں کا کلیجہ کاٹ لاؤ تو سمجھوں کہ واقعی تمہیں مجھ سے سچی محبت ہے۔ عشق اندھا ہوتا ہے۔ لڑکے نے اس جذبۂ عشق کے ہاتھوں مجبور ہو کر، ماں کی برس ہابرس کی ممتا، اس کی پرورش، دیکھ بھال، آرام و آسائش کے سامان مہیا کرتے رہنے کا، کوئی خیال نہ کیا۔ کہاں وہ برس ہابرس کی ماں بیٹے کی محبت اور کہاں یہ چند روزہ عشق کا ہیجان۔ عقل و ہوش کے بندھن ٹوٹے۔ نہ دنیا کا خیال آیا، نہ معاشرہ

کا، نہ خدا کا، نہ اپنے انجام کا۔ ایک رات ماں کا کلیجہ کاٹ کر چلا۔ ناگاہ پاؤں میں ٹھوکر لگی۔ اللہ رے ماں کی ممتا کہ اس حالت جانکنی میں بھی ماں کی زبان سے یہی الفاظ نکلے، کہ بیٹا! پیر میں چوٹ تو نہیں آئی۔ اس معمولی واقعہ سے مجازی ربوبیت کا اندازہ لگائیں۔ پھر اسی سے ربوبیتِ حق اور رَحمتً لِلّعالمینی کی شدتوں کا اندازہ کریں۔ ساتھ ہی عشق کی فتنہ سامانیوں کا اندازہ کریں کہ عشق کیا کچھ نہیں کراتا۔ محبوب کے لیے سب کچھ قربان، ماں باپ قربان، دو عالم قربان، آخر یہ جذبہ بھی تو انسان کے حدود اختیار سے باہر کی چیز معلوم ہوتا ہے۔ گویا عشق میں نہ عقل و ہوش، نہ تدبر و ادراک، نہ معاشرہ نہ مذہب، نہ عاقبت نہ خوفِ خدا، جیسے جذبہ عشق ہر جذبہ پر سبقت لئے جا رہا ہو۔ جیسے خود ربوبیت عشق پر قربان ہو رہی ہو۔ عشق کے آگے کیا زُھد، کیا تقویٰ، کیا علم کیا عرفان۔ ایک اور واقعہ ہے کہ ایک بزرگ جو ریاضت و عبادت، صداقت و پارسائی، زہد و تقویٰ، علم و عرفان کی زندہ تصویر تھے، ایک یہودی کی لڑکی پر عاشق ہو گئے۔ بہرصورت اس لڑکی کو حاصل کرنا چاہا، قرب حاصل کرنے کے لیے اس کے گھر ملازمت طلب کی۔ باپ نے پیچھا چھڑانے کے لیے بارہ سال سُور چرانے کے شرط پیش کر دی۔ انہوں نے یہ بھی کر ڈالا۔ نہ اپنی حُرمت و ناموس کا پاس رہا، نہ پاکی و طہارت کا، نہ دین و ایمان کا۔ انہوں نے عشق کے ہاتھوں اپنے برس ہابرس کے زہد و تقویٰ کے سرمایہ کو یوں کافروں کے قدموں میں لا ڈالا۔ حرام اور حلال تک کی تمیز اٹھ گئی۔ اپنے عشق کی حُرمت کے لیے دونوں عالم سے ہاتھ دھو کر، عشق کی آگ میں کود پڑے۔ محبوب تو کیا ملنا تھا مگر اپنی ہر اعلیٰ اقدار کی قربانی پیش کر دی۔ عشق میں یوں شہادت پالی۔

اب بات سوچنے کی یہ ہے کہ اس جذبہ کے آگے آخر انسان مجبور محض کیونکر ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں ''اَلعِشقُ نَارٌ مُحرِقٌ'' عشق ایک بھڑکتی آگ

ہے۔ عشق کی آگ ہر ماسوا کو جلا دیتی ہے۔ عشق ہوا تو اپنا اچھا برا سب جلا، مشک کو بر سب جل کر راکھ ہوئے، سب صفات سے پاک ہوئے، سب کی لا ہوئی۔ مشکِ ذات میں بس گئے۔ صرف محبوب باقی رہا۔ عکسِ رخسارِ دوست پتے پتے، ذرّے ذرّے میں عیاں نظر آیا۔ ایک توحیدی جھلک کائنات میں ملی۔ ایسے عالم میں کیسا شرک، کون کس کا شریک، ہر جانب تُو ہی تُو، اندر تُو باہر تُو اسی عالم کیف و مستی میں اپنا آپا بھی تو کوئی غیر نہیں۔ غیر حق ہو کیا سکتا ہے۔ اب عشق بھی پیچھے رہا۔ اس حالت میں ایک ہے تو بس دوست ہے۔ معراج میں بھی رَبّی اور دم آخر بھی ''اِلَی الرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی'' گویا ایک یکتائی وحدت ہے۔ ایک لذتِ دوام ہے۔ ''لولاک لما خلقت الافلاک'' اس وحدت کیف کی تجلی جس پر پڑی اسے انائے مطلق کا شعور ہوا۔ وہی اظہار کی تڑپ، وہی محبوب کے گرد رقصِ دوام۔ یہ عشق کی آگ آخر ہے تو اپنے اندر کی بات یہ اور صورت ہے کہ کسی میں کم کسی میں زیادہ اور کسی میں اس کے آباؤ اجداد کے نسلاً بعد نسلاً تاریک دوروں سے گذرنے کے بعد بالکل سرد۔ اس عشق کی داستانوں سے دنیا کے گوشہ گوشہ کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ البتہ ہر مذہب و ملت کے معاشرتی اصولوں اور تقاضوں کی کسوٹی پر کچھ داستانیں احسن شمار ہوئیں اور کچھ ننگِ انسانیت۔ یہ اپنے اپنے پیمانوں اور میزان کی بات تھی۔ قرآن نے ''اَحْسَنُ الْقَصَصْ'' بھی اسی عشقِ زلیخا اور حضرت یوسف کی داستان کو کہا ہے۔ عاشق ہوتے ہوئے اپنے میزان پر قائم رہنا دشوار امر ہے، مردوں کا کام ہے۔ اگر عشق کو مادی سطح سے آگے نہ بڑھنے دیا تو سانپ بن کر ڈس لیتا ہے، اور اگر دل کی روشنی بنایا تو یار تک پہنچا دیتا ہے۔ یہ میزان قلندر کی میراث ہے۔ اس کے عشق کا وہ عروج ہے کہ عشق اپنی منزل آپ ہے۔ اس کے لیے افق پیش نظر ضرور ہوتا ہے مگر اس تک رسائی کبھی نہیں ہوتی۔ وہ

اپنے انجام، اپنی بدنصیبی سے واقف ہوتے ہوئے بھی اس راہ سے کبھی نہیں ہٹ سکتا۔ بات بس اس بال سے زیادہ باریک راہ پر بھی ثابت قدم رہنے کی ہے۔ اپنی جاں بازیاں، اپنی قربانیاں، اپنی شہادتیں ہی اسکی راہ کی سواری بن کر سلامتی سے گذار دیتی ہیں۔ پھر جس کے سامنے اس بال سے زیادہ باریک راستے کے دوسرے کنارے پر محبوب ہو اس کے قدم کو اس راہ پر لغزش کیسے ہوسکتی ہے۔ عشق ایک قابل اعتماد سواری ہوتا ہے، اور دست محبوب اسے اس راہ سے گذار لینے کے لیے اپنی رحمتوں کے انوار میں اس کی اعانت کرتا ہے۔ ورنہ یہ وجود، یہ عقل و ہوش، یہ تدبر و دانائی، یہ ریاضت ومجاہدات یہ فہم وبصیرت، کہاں تک ساتھ دے سکتے ہیں۔ رحمت بے کراں ہر شئی پر محیط ہے۔ اور صرف اسی کے سہارے ایسی راہوں پر نہ ختم ہونے والا سفر ہوتا رہتا ہے۔ یہ طلب کی شدت اور یہ بے چینی، اپنی اختیاری چیز نہیں، یہ عطائی بات ہے۔ یہ قلندر کا نصیب ہے۔ ایک قلندر ہی حسن ازلی کو ایک چٹکتی کلی میں، شمع کے سوز میں، معصوم آنسوؤں میں، خلقت کے غم میں، عشق کی تڑپ میں، بجلی کی چمک میں، حسن کی اداؤں میں، پروانے کے طواف میں، بے نقاب دیکھتا ہے۔ وہ معشوق حقیقی کی تجلی ہر عکس رخسار میں بغیر حسین کے وجود کے دیکھتا ہے۔ یہ پروانے والا عشق ہے جو اس کے باطن میں چھپا ہے، اس کے غیب میں ہے۔ شمع کی روشنی کے آگے ہی وہ اس عشق کا اظہار کرسکتا ہے، وگرنہ ساری عمر غیب کے غیب میں رہ کر، اس آگ میں جل کر بھسم ہو جاتا ہے۔ یہ عشق، دو عالم کی بندشوں سے آزاد ہوتا ہے۔ محبوب کے درکا گدا در پر ہی پڑا رہنا چاہتا ہے۔ جنت اور بہشت سے بے نیاز ہوتا ہے۔

گدائے کوئے تو از بہشت خلد مستغنیست
اسیر بند تو ازھر دو عالم آزاد است حافظؒ

عشقِ رسول ﷺ:

مومن کا عشق نبی کریم ﷺ اس طرح ان شدتوں میں ہے جو وہاں دربارِ محبوب میں جا کر جان قربان کر دینا چاہتے ہیں۔ مگر ان کو اُمتی اُمتی کی سنت کی ادائیگی کے لیے بشارتوں کے ذریعہ روک دیا جاتا ہے۔ خدمتِ اُمت کے لیے انہیں چن لیا جاتا ہے۔ اس عشق محبوب، غم اُمت کے جذبہ میں کسی اور کا ایمان بچانے کے لیے وہ اپنا ایمان بھی قربان کر دیتے ہیں۔ خلقت کی بخشش، خلقت کی جاں بخشی کے لیے وہ اپنی جان کا صدقہ پیش کرتے ہیں۔ یہی لوگ محبوب پر شہید کہلانے کے مستحق ہیں۔ آج اس اُمت کو جو انعام حاصل ہوا ہے وہ غلامی مصطفیٰؐ ہے۔ یہ طالبِ حق کے لیے خود پرستی سے نجات ہے۔ حق تعالیٰ نے بھی فرمایا ہے کہ مجھ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو نبی پاکؐ سے محبت کرو۔ البتہ ہم نے اس فرمان کو اپنے طلبِ حق وحقیقت میں نظر انداز کر رکھا ہے۔ ہمیں مملکتوں تک کے انعامات ملے۔ ان کی ہم نے ناقدری کی، توہین کی، اپنی انفرادیت میں، مقامات اعلیٰ کی فکر میں ایسے لگے کہ سب کچھ بھول گئے۔ گویا اپنے ظاہری جسم پر تو عبادتوں اور ریاضتوں کا اطلس پہنا مگر اپنے بدن کو محبت کا غسل نہ دیا۔ باطن کو نہ سنوارا۔ اب فرداً فرداً ایسی حالت کر لی کہ جیسے چھوٹے چھوٹے تالابوں میں پانی جمع کر لیں تو گندا ہو ہی جاتا ہے۔ ایسے میں بند ہی توڑنے پڑتے ہیں۔ پھر بھی رؤف الرحیمی ہے کہ ہر مومن کے باطن میں عشق نبی ﷺ ضرور ہے۔ اس کا ظاہری اعمال سے تعلق نہیں۔ یہ اندر کی بات ہے کیونکہ جب قلب کی شمع بجھ چکی ہو تو تقریر، وعظ و نصیحت، ظاہری ارکان کی پابندی سے کیا کام بن سکتا ہے۔ چاہیے تو یہ کہ طالب کے آگے شمع روشن کر دو وہ خود ہی پروانہ وار فدا ہوگا۔ پروانہ کا طواف شمع کی روشنی

ہی میں ممکن ہوتا ہے، یہ اور بات ہے کہ عشاق کے لیے یہ شمع باطن ہی میں روشن کی جاتی ہے۔ دیکھیں تو کائنات کی ہر شے طواف میں ہے۔ کیا سیارے، کیا ستارے کیا چاند، سورج زمین، کیا ایٹم، ہر شے میں دو قوتوں کا ظہور ہے۔ ایک کشش ہے، مرکز کی جانب، اندر کی جانب اسے محبوب کی محبت کہہ لیں۔ پھر ایک اپنی قوت ہے جو باہر کی طرف لے جاتی ہے۔ اسے انا کہہ لیں، نمود کی بے قراری کہہ لیں۔ ان دونوں قوتوں کی موجودگی ہی میں اور ان دونوں قوتوں کے ہوتے ہوئے ہی ایک راہِ میزان نکلتی ہے، جس میں طواف ہوتا ہے۔ گویا محبوب کی قوت کی اپنے باطن میں جلوہ سامانی اور اپنے عشق کا شوقِ دوام۔ دل میں یہ شمع روشن ہو تو طواف خود شروع ہو جاتا ہے۔ ایک دائمی حرکت، سکون میں رقص پروانہ ہونے لگتا ہے۔ لیکن جب نہ اندر کچھ ہے نہ پروانے جیسی جانثاری ہے، نہ پروانے جیسی شمع کے لیے کشش ہے تو کیسا طواف۔ جن کے لیے کوئی شمع ہی نہ ہو، وہ کیا خاک طواف کر سکتے ہیں۔ اس لیے جیسے ہی اس اُمّت مرحومہ کی توجہ اپنے مرکز، شمع محمدیؐ کی طرف ہوگئی، جیسے ہی ''اِنِّیْ وَجَّھْتُ'' کہنے کے حقدار ہوئے، یہ طواف، یہ پروانہ وار فدا ہو جانا، یہ شوقِ شہادت کا جذبہ خود بخود ابھر آئے گا۔ اسکے لیے نہ قسمت کا رونا رونے کی ضرورت ہوگی نہ ترکِ سنت کا شکوہ کرنے کی۔ نہ وعظ و نصیحت کو ذریعہ تجدید دین کرنے کی۔ عاشقوں اور عارفوں کی دنیا تو شمع کی تجلی میں روشن ہوتی ہے۔ جیسے ہی اس تجلی کو پایا، سب طور طریق، نہی منکر صحیح بیٹھنے لگیں گے۔ بات صرف محبوب کی جانب رخ کرنے میں ہے۔ وہ تو ہیں ہی ''حَرِیْصٌ عَلَیْکُم'' پھر یہ توفیق کہ ہم محبوب صلی علیہ وآلہ وسلم کی جانب رجوع ہوں۔ اسی حق سے کیوں نہ مانگیں جس کا فرمان ہے کہ جس نے انؐ کی جانب رخ کیا، اس نے حق کی جانب رجوع کیا، جس نے اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی، اس نے اللہ

کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ یہ یک رخی، یک بینی کی بات صرف عشق کے جذبے ہی میں ممکن ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ان عشاق کی زندگی طوافِ محبوب، ان کی حد نظر روئے محبوب، ان کی رسائی پائے محبوب ہوتی ہے۔ ان کے لیے نسبتِ عشق قائم رکھنے کی یہی بات ہے کہ سخت سے سخت آزمائش میں بھی نظر محبوب سے نہیں ہٹتی اور نہ ہی لطف و اکرام کی بارش میں ادب کا دامن ہاتھ سے چھوٹتا ہے۔ تب ہی کہیں عاشقوں پر یہ قول صادق آتا ہے کہ ان کے جسم و اعضاء کی بناوٹ، عشق کی مٹی اور تجلی کے نور سے ہوئی ہے۔ اسی لیے عاشق شدت پسند، مشکل پسند اور ایک قسم کا متکبر ہوتا ہے۔ مگر عزازیل کو جو تکبر کی سزا ملی تھی وہ اسے ملتی ہے۔ البتہ کسی کا دستِ کرم پیٹھ پر ہو تو سر جھکائے رکھتا ہے۔ اللہ بننے کی کوشش نہیں کرتا۔ بندہ بننے کی کوشش کرتا ہے۔ اس حالت میں اس کا عشق خود روشنی کی طرح نچھاور ہوتا ہے۔ دوسروں کو بھی روشن کرتا ہے اور جس میں صلاحیت ہو اس میں بھی چنگاری لگا دیتا ہے۔ اب عرفان کی بات یہ ہے کہ محبوب، ہادیٔ حق کی تجلی کا اپنے میں عرفان ہوتا ہے اس کے لیے اپنی ہستی، اپنی خودی کو یکسر فراموش کر دینا ہے۔ اپنا کچھ نہیں، اپنی تمام صفات معدوم اور صرف حق موجود۔ غیر اللہ کا خیال بھی دل میں نہیں، نہ یہ وہم و جہالت کہ مَیں ہوں۔ یہ اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب اپنے آپ کو کُلّی طور پر مرشد کے حوالے کر دیں، سر دے دیں۔ اس محبوب، اس حق کی کارفرمائی کو کلیت میں اندر باہر جلوہ گر دیکھیں اور اندر تصدیق پائیں۔ جب سارے وہم ختم ہوئے، ساری دوئی ختم ہوئی، حق ثابت ہوا، تو زبان بند ہوگئی۔ اس عرفان کی حالت کے بیان کرنے سے بھی قاصر ہوئے۔ نہ اس تجلی، اس روشنی کا انکار کر سکے، نہ اعتراف۔ راضی بہ رضا ہو کر رضی اللہ عنہ کہلائے۔ یہ محبوبیت کا روپ ہے۔ البتہ اگیان یا ظلمت کا پردہ اٹھنا ہر ایک کی اپنی صلاحیت پر منحصر ہے۔ ہر ایک کے لیے

وہی راہ آسان ہوتی ہے جو مقدر کے مطابق ہو، مثلاً کچھ میں عشق کی صلاحیت ہے تو کچھ میں کھوج اور تلاش کی، کچھ میں عمل کی قدرتی صلاحیت ہے تو کچھ میں مجاہدات اور ریاضتوں کی۔ اور چونکہ تلاش حقیقت روح کی طلب ہے، اس کی فطرت میں ہے اس لیے بہرصورت طلب وجستجو کو انسان کی زندگی کا چراغ بننا ہے۔ جبلتیں (نفس الٰہی) کاروبارِ جہاں میں اگر انسان کو ایک طرف کھینچتی ہیں، تو وہ پھونکی ہوئی روح (سنت الٰہی) اس کی قدّ وسیت کی جانب لے جاتی ہے۔ ان دو قوتوں کے درمیان زندگی گذرتی ہے۔ اس لیے فطری جبلتوں کو علم، مذہب کی روشنی دے کر، ایک یک رخی دے کر، انسان کو چاہیے کہ ''احسن التقویم'' بن کر فرشتوں سے بھی آگے نکل جائے۔ اگر ایسا نہ کیا اور ان استعدادوں کو صرف اپنی حیوانی وجود میں استعمال کیا تو ظاہر ہے کہ ''اَسْفَلُ السَّافِلین'' میں جا پڑتا ہے۔ لہٰذا انسان کی فکر کی خوبی اور حسن یہی ہے کہ نفس، خیالات، محسوسات سے بلند ہو کر اس وجود کے تعینات سے نکل کر اعلیٰ اقدار، مجردات اور لطافتوں میں زندگی گذارے، جو حقیقت کا ادراک ہو سکے۔

حق کی جانب رُخ:

نگاہِ بصیرت سے دیکھیں تو ذاتِ خداوندی ہر جگہ موجود ہے۔ غیر اللہ کا امکان بھی کہاں ہے۔ ہستی صرف اللہ تعالیٰ کی ہے جو ہر وقت ہمراہ ہے۔ تنہائی کیسی۔ جب طالب کو خدا بینائی دے تو پھر اپنے کو بھول کر اسی سے دیکھتا اور سنتا ہے۔ ہر ذرّے میں سوائے اس کے چہرے کے کچھ نہیں دیکھتا۔ اس کے لیے ہر ذرہ جامِ جہاں نما ہوتا ہے۔ اس کے دل میں سوائے حق کے سب کچھ دور ہو جاتا ہے۔ دنیا کی حرص وہوا، خواہش یا آرزو سب ترک ہو جاتی ہے اور یہ ترک خود اس

بات کی نشانی بنتی ہے کہ حق کی جانب رخ ہے، اسی کی طرف متوجہ ہیں۔ اس کے ساتھ ہی جو نیک کاموں کی توفیق ہوتی ہے وہ اس بات کی پہچان ہو جاتی ہے کہ قرب کا دروازہ کھل گیا ہے۔ اس طرح اپنے طلب، شوق، درد، سوز، حیاتِ نو کا سامان بنتے ہیں۔ اب بندہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ پھر جس نے اللہ کو یوں پہچان لیا، یوں پا لیا، وہ ایک کامل سکون اور سکوت میں آیا۔ راضی بہ رضا ہو کر وفا والوں میں شمار ہوا۔

دیکھا جائے تو طالب بننا، ایک یک رخی کی بات ہوئی یکے خواہم، یکے نیستم کی بات ہوئی۔ اس کے لیے یہ کثرت، یہ تعینات کائنات، یہ وجود سب کا سب رخسارِ دوست بھی ہے اور ایک نقطہ بھی۔ یہ ب کا نقطہ اپنی انا ہے۔ یہ انائے مطلق (یعنی نفس واحدہ) کا عکس ہے اس لیے اس کی خود اپنی کوئی حقیقت نہیں۔ اور اس میں اپنی خودمختاری کا زور بھی اسی انائے مطلق کے عکس کی وجہ سے ہے۔ اس لیے عرفان میں جتنی گہرائی میں اترتے چلے جائیں، اپنی ''میں'' کی فنا کرتے جائیں تو اس ''میں'' کی جگہ ''تُو'' آتا جاتا ہے۔ اور یہ راز کھلتا ہے کہ جو کچھ عرفان ہے بس ایک نقطہ ہے، کہ جو کچھ ہے وہی ذاتِ حق ہے۔ لہٰذا فقر اور تصوف میں بھی اس انائے جزوی میں محدود رہنے کی بجائے انائے مطلق سے رابطہ قائم رہنا ہے۔ انفس و آفاق کو ایک توحیدی انداز میں توازن میں لانا ہے۔ اس لیے صحیح عارف کہلانے کا وہی حقدار ہے جو انفس اور آفاق دونوں میں زمانہ کی لگام تھامے ہو، تب ہی اسے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ زمانہ جسے کہتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کا نور ہے اور یہ انائے مطلق ہی کی کارفرمائی ہے جو ظاہر باطن، فرد جمعیت، تقدیر تدبیر پر حاوی ہے۔ اس طرح طالبِ حقیقت کے لیے ایک آفاقی راستہ ہے جو ادراک اور شعور کا پابند ہے۔ اسے علم کہہ لیں۔ اور دوسرا انفاسی، جس کا تعلق قلب کی کیفیات سے

ہے، اسے حُب کہہ لیں۔ اس حُب وعلم کے توازن میں ان دو، دریاؤں، مجمع البحرین میں پہنچ کر ہی، کہیں بحرِ حقیقت سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔ ذات کی جانب رجوع ہو سکتے ہیں۔ اور جنہوں نے ظاہر باطن میں ذاتِ حق کی جانب رجوع نہ رکھا، ہر سمت ''وَجْهُ رَبِّی'' نہ دیکھا تو ان کی نگاہ بھی بھٹکی اور کعبہ ذات کا رخ بھی نہ ملا۔ کیونکہ جب تک کعبہ الٰہی کی قدوسیت، صمدیت، سبحانیت مبارک حول سے نہ گذرے صحیح بندگی کہاں نصیب ہوتی ہے۔ یا جب تک مادیت کے نقش ونگار اور اپنے جہل میں گرفتار رہے اس وقت تک اندر باہر حی وقیوم کی تجلی کہاں پا سکتا ہے۔

نشوی واقفِ یک نکتہ زاسرارِ وجود
گر تو سرگشتہ شوی دائرہ امکان راہ
حافظؒ

یوں عام انسان کو دیکھیں تو ہر شخص نے کسی نہ کسی فانی چیز کو اپنا محبوب و معشوق قرار دے رکھا ہے حالانکہ ایسا ساتھی تو ہو جو قبر میں ساتھ جائے۔ اس طرح انسان حرص دھوا کا پیرو ہے حالانکہ قرآن نے ترک دنیا کو عبادتِ سر بتایا ہے۔ اس نکتہ کو العلم نکتہ کہا ہے۔ علم کی ضرورت پر نہیں بلکہ عمل پر زور دیا ہے۔ اس طرح ہر شخص دنیا کے لیے کوشش کرتا ہے، رنج ومصیبت برداشت کرتا ہے۔ حالانکہ یہ سب ختم ہونے والا ہے۔ یا آدمی عز وشرف کو کثرت خویش واولاد سمجھتا ہے حالانکہ شرف تقویٰ پر ہے۔ یا انسان آپس میں دشمنی رکھتا ہے، حالانکہ اس نے شیطنت نہ کرنے کا خدا سے وعدہ کیا تھا۔ ایسے ہی انسان ایک دوسرے سے مال و مرتبہ کی وجہ سے حسد کرتا ہے حالانکہ روزی مقرر ہے۔ یا انسان روزی معاش کی سر توڑ کوشش کرتا ہے حالانکہ رزق اللہ کے ذمہ ہے۔ یا انسان کو کسی نہ کسی پر بھروسہ ہے حالانکہ اللہ ہی پر بھروسہ کافی ہے۔ اس طرح انسان پر مخلوق یا اپنی ''میں'' کا

پردہ ہی جہالت، غفلت اور ظلمت کا باعث ہوتا ہے۔ جب یہ جہالت اور اگیان کا پردہ اٹھ جائے، تب ہی سارے ملک پر اسی خدا کی حکمرانی نظر آئے گی۔ اب اسے نہ مخلوق سے غرض رہے گی نہ اپنے سے۔ وہ اپنی ذات اور مخلوق دونوں سے پردے میں ہو جائے گا بلکہ پردہ بھی لاشے ہو کر اس کے لیے دنیا و عقبیٰ کی مانند ہو جائے گی۔ زندگی موت حی و قیوم کی تجلّی بن جائے گی۔ بقولِ حافظؒ

عارفے کو سیر کرد اندر مقام نیستی
مست شد چوں مستی از عالم اسرار یافت

الغرض باطن میں غوطہ زنی اور ظاہر میں "احسن التقویم" بن کر ہی، یعنی اندر باہر حیُّ و قیوم کی تجلّی میں ہی کہیں انسان "مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ" کا مصداق ہو سکتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے بھی فرمایا ہے کہ انسان کے بوجھنے کے پانچ تن ہیں۔ ہر تن کے پانچ دروازے ہیں اور پانچ دربان۔ عارفوں نے اس کی تشریح یوں کی ہے۔

پہلا تن:

اس کا ظاہر وجود۔ مقام اس کا شیطانی۔ نفس اس کا امارہ۔ دروازے اسکے حواسِ خمسہ۔ ذکر یہاں کا بالجہر۔

دوسرا تن:

ممکن الوجود (جو وجود کے امکان میں ہے) نگہبان اسرافیل (مرشدِ ہادی) نفس اس کا لوامہ۔ دروازے حواسِ خمسہ۔ (حواس پر دوست چھائے۔ غیر کا غلبہ نہ ہو) ذکر یہاں کا قلبی۔

تیسرا تن:

ممتنع الوجود (وجود کو جس کی ممانعت ہے) نگہبان عزرائیل ''مُوْتُوْ قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوا'' قلب و روح کا درمیانی پل پار کراتے ہیں۔ نفس ان کا مطمئنہ۔ دروازے حواس خمسہ جن سے گذر کی حق کے علاوہ ممانعت ہو۔ ذکر یہاں کا روحی۔

چوتھا تن:

حقیقت محمدی ﷺ (نورانی وجود) نگہبان جبرائیل (روح الامین یار سے رابطہ قائم کراتے ہیں)۔ دروازے حواسِ خمسہ جن پر جبرائیل طاری ہو۔ ذکر یہاں کا سرّی۔

پانچواں تن:

واحد الوجود، (خدا کا دروازہ) نگہبان ابلیس (صرف یگانے کو آنے دیتا ہے)۔ دروازے حق کی آنکھ سے دیکھنا۔ عشق کے کان سے سننا۔ محبت سے سونگھنا۔ زبان سے الہام سے محبت کرنا۔ ذکر یہاں کا خفی۔

علم الیقین:

دیکھا جائے تو بندے کو خدا کا علم اور اس کی اپنے اندر معرفت، فطری صلاحیتوں کے عطیے اور حق تعالیٰ کی ازلی رہنمائی کے بغیر ممکن نہیں۔ کیونکہ وہ وارفتگی شوق جسے محبوبیت، جسے عرفان کہہ لیں، ایک مستِ باہوش کے مقام سے کم کی بات نہیں۔ پھر اس مقامِ قرب میں بھی بندگی، عاجزی، نیاز مندی، ادب کو ہاتھ سے نہ جانے دینا ایک عام انسان کا کام کہاں ہوسکتا ہے۔ یہ سب کچھ ادھر

سے نواز لیے جانے کی بات ہے۔ اپنے اندر سما جانا ہے جو ''ھُوَ الظَّاھِر ھُوَ الْبَاطِن'' ہے۔ شہ رگ سے بھی قریب ہے اس لیے انفس آفاق میں جب تک اس کی حکمرانی، اس کی جلوہ گری نہ پائیں مَنْ عَرَفَ کے آئینے میں تجلّی کی جھلک کہاں مل سکتی ہے۔ صرف رہنمائی حق دستِ کرم کے طفیل ہی انسان کو اپنی ذات اپنے اسماء وصفات، جسمیت مکانیت سے پاک نظر آ سکتی ہے۔ مادہ، مدت، مقصد، حرکت، قوت سے بے نیاز معلوم ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد ہی ذاتِ حق کے عرفان کی راہ اپنے میں ہی نظر آ سکتی ہے۔

اس کا پہلا قدم علم الیقین ہے کہ سن کر یا کسی نشانی کے ذریعے جب پختہ یقین حاصل ہوا تو شدت شوق جاگ اٹھی۔ نورِ علم کے ذریعہ ادراکِ حقیقی نصیب ہوا، ذات کو حیثیتِ اسماء پہنچانا، اس کی صفات سے متصف ہوئے۔ اسم کو روح کے ساتھ نسبت تھی اس لیے اسم کی معنویت کو پکڑا تو اس کے نور تک رسائی ہوئی۔ اسماء کی جانب سے تجلیاتِ صفات وارد ہوئیں تو یکے بعد دیگرے صفات کا مشاہدہ ہوا۔ واقعات میں اللہ کی حکمتیں نظر آنے لگیں۔ شرعی حکموں کے راز یا آخرت میں اعمال کے نفع معلوم ہوئے۔ مخلوق کی تمام حرکات وسکنات کا خدا کے سبب سے عرفان ہونے لگا۔ وہم، شک، شبہے دور ہوئے۔ شوق طلب اور بھی بڑھا اور شدت عمل بھی۔ اب نتیجہ سے بے نیاز ہو کر منزل کی جانب چلتے رہے۔ ایک قدم اپنا لیا تو دس قدم مقصودِ حقیقی کو اپنی جانب بڑھتا پایا اس معرفتِ الٰہی سے دل کی زندگی ملی، روشنی ملی۔ حق تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ہم نے دنیا کے اندھیروں سے جنہیں رہائی دی ہے، ان کے دل اپنی معرفت میں زندہ کر دیئے ہیں۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ اگر تم خدا کو پہچان لیتے جیسا کہ اس کے پہچاننے کا حق ہے تو تم سمندروں پر پا پیادہ چلتے اور تمہاری دعا سے پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جاتے۔

اب تازیانۂ شوق کے لیے اگلی منزل عین الیقین ہے کہ دیکھ لیا نہ کسی بیان کی ضرورت رہی نہ نشانی کی۔

اے لقائے تو جواب ہر سوال

جب خود دیکھا، ان ہی آنکھوں سے دیکھا تو انکار کی کہاں گنجائش مگر دیکھنا تو صرف مادّی آنکھ کا ہی ہوا کرتا ہے۔ اس میں سو دھوکے، سو فریبِ نظر۔ آخر ابو جہل نے بھی دیکھا تھا، ابلیس نے بھی جنت، جہنم، عرش و کرسی کا نظارہ کیا تھا لیکن یہ دید اس کے لئے معرفت کا سبب نہ بن سکی۔ اسی طرح لوگوں نے طرح طرح کے نظارے راہِ معرفت میں دیکھے اور ان ہی میں رہ گئے۔ اپنے کو عارف سمجھ بیٹھے۔ تب ہی حق تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم کافروں پر فرشتے بھی نازل کرتے تب بھی ایمان نہ لاتے لیکن جب اللہ چاہتا۔ اس لئے معرفتِ الٰہی کے لئے اصل رہنما اور دل کھولنے والا حق تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں۔ اس کی تائید اور توفیق کے بغیر وہ آنکھ نہیں ملتی جسے عرفان کہیں۔ کہ آنکھ نے دیکھا، اِدراک نے شعور کیا، قلب کے آئینہ میں سند ملی اور روح سے اس کی تائید ہوئی۔ اب کہیں عین الیقینی میں اسے پایا۔

کسی مظہرِ کامل کے وجود میں حق عینیت کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ واقعی آمنا سامنا ہوا تو آنکھ بھی کیسے جھپکے۔ یا شدتِ طلب عطا ہوئی تو چشمِ باطن سے ہر فعل کے پیچھے فاعلِ حقیقی نظر آیا۔ کوئی شے ایسی نہ دیکھی کہ اس کے سامنے اللہ کو نہ دیکھا۔ یا قلندری کی وہ نظر پائی کہ حسن کو بغیر حسین کے دیکھا، تجلّی ملی تو تڑپ کر بے ہوش ہوئے یا پھر موجودات سے ایسی آنکھیں بند کر لیں کہ دائماً مشاہدہ نصیب ہوا۔ مجذوب ہوئے یا محبتِ الٰہی میں ایسے غرق ہوئے کہ کبھی ہوش میں آئے تو وہ ہی شوقِ دیدار، وہی آنکھوں کی پیاس۔ یار آنکھوں ہی میں اتر آیا، عینیتِ عین ہوا۔

اس سے پہلے دید ار کی خواہش بھی حجاب تھی ۔محبت میں ارادہ کا ہونا اور بھی رکاوٹ اور حجاب تھا۔ جب ارادہ ہٹ گیا تب ہی مشاہدہ میسر آیا، تب ہی زمان، مکان، دنیا، عقبیٰ کی تمیز اٹھ گئی۔ عارف اب نُورِ یقین سے ان اسرارِ حق کو دیکھنے لگا جو مخلوقات نہیں دیکھ رہی ہوتیں۔ اب محویتِ جمال میں ایک حیرتِ نظارہ کی کیفیت وارد ہوئی کہ نہ ناظر نہ نظر۔ بس حق نے حق کو دیکھا۔ روح کو اس دید ار کی غذا نصیب ہوئی۔محبوبیت اپنے ہی وجود میں سمانے لگی حق الیقین وارد ہونے لگا۔ اب سے پہلے تک جس بات پر حق الیقین تھا وہ اپنی ''مَیں'' تھی کہ یہ سوال اپنی جگہ تھے کہ مَیں کیا ہوں یا مَیں کا عرفان کیسے ہو۔ اسی طرح ذاتِ حق کے ہونے میں تو کوئی شبہ نہ تھا۔لیکن حق کیا ہے۔ اس کی جھلک تو ملی، مگر تشنگی کی تشنگی رہی۔ یہ صحیح تھا کہ خدا کے سوا جو بھی موجود تھا وہ باطل ۔تو اگر طالب بھی اگر خدا کے سوا ہے تو اس کی صفت بھی جمالِ الٰہی کے مشاہدے میں باطل ہوگئی۔ اس حالت میں اپنی انائے مطلق میں غیریت نہ رہی ۔اس محویت میں یار ہی کی جلوہ گری ہے۔ہر غیر کی ''لا'' ہے۔اپنے نے اپنے کو پا لیا ہے۔ انائے انفرادی انائے مطلق میں ضم ہے۔ جاننا ہو جانا، ہوگیا ہے۔ ایک ہی ذات باقی ہے۔سراپا غلبۂ محبت میں خود بھی محبوبِ حقیقی کی حدیث بن گئے ہیں۔خود اسماء وصفات میں ظاہر ہوئے ہیں۔ ایسے کہ جسم بھی تو، روح بھی تو مٹی بھی تو، نور بھی تو۔ یعنی کبھی طالب کبھی مطلوب۔کبھی بندہ کبھی بندہ نواز، کبھی عارف، کبھی محبوب۔ تیری ذات باکمال، تیری شان بے مثال ''لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٍ'' اب اگر چاہا تو مردے کو زندہ کر دیا۔ مادر زاد اندھوں اور کوڑھیوں کو اچھا کر دیا۔ لفظِ کُن سے چیزوں نے اثر قبول کرنا شروع کیا۔جس چیز کو نورِ عقل نے ممکن بنایا یعنی جو چاہا اسی پر امرِ کُن صادر کر دیا۔مرضوں، بیماریوں کو اچھا کیا۔ یا ہاتھ سے کئی نئی چیزیں پیدا کر دیں۔ پاؤں سے ہوا میں چلے یا ہر

صورت میں متصور ہوئے۔ جسم کے تمام اجزاء سے خلّت کے آثار ظاہر ہوئے۔ حق تعالیٰ اپنے ہاتھ پاؤں آنکھ کان، بنے، ان اعضاء سے چیزیں متاثر ہونے لگیں۔ یہ کیفیات نہ بیان میں آسکتی ہیں نہ جھٹلائی جاسکتی ہیں کیونکہ خود حق ہی عارف میں جلوہ گر ہوتا ہے۔

برخلاف اس کے عاشق اس قول کی تفسیر ہوتا ہے کہ

من کہ باشم درآں حرم کہ صباء
پردہ دارِ حریم حُرمتِ اوست
حافظؒ

یعنی تیرے عشق کے سلسلے میں میرے دل میں ایک راز پنہاں ہے کہ اگر سر بھی دینا پڑے تو اے محبوب میں کسی سے ظاہر نہ کروں گا۔ اپنے سے بھی پوشیدہ رکھوں گا کہ شرمسار نہ ہوں۔ کہتے ہیں کہ جب عشق پیدا کیا گیا تو لاکھوں زنجیریں بھی اس کو قابو میں رکھنے کے لئے پیدا کی گئیں۔ اور لاکھوں ڈوریاں بھی جو اس کو محبوب کی جانب کھینچتی رہیں۔ اسی لئے عشق کبھی کم نہیں ہوتا، روز بروز بڑھتا ہی ہے۔ لاکھ ملامتیں پڑیں، لاکھ قتل کئے جائیں، مگر محبوب پر ایک جان نثار کر دینا ہی کیا، ہزاروں ایسی جانیں قربان۔

وفا کنیم و ملامت کشیم و خوش باشیم
کہ در طریقتِ ما کافریست رنجیدن

مثال کے طور پر عشقِ مجازی ہی کو لیں کہ مجنوں جب تک زندہ رہا محبت میں سرشار رہا، مرا تو اس کی محبت میں غرق مرا اور قیامت میں بھی اسی طرح غرقِ محبت ہوگا۔ اسے تابِ دید کہاں تھی۔ جب لوگ ترس کھا کر اسے لیلیٰ کی حرم گاہ

تک لے چلے تو لیلیٰ کا سایہ بھی ظاہر نہ ہوا تھا کہ تڑپ تڑپ کر بے ہوش ہو گیا۔ اس طرح دیکھا جائے تو عاشق یا عارف بننا فطری صلاحیتوں پر منحصر ہے جو عطائے الٰہی ہے اور ان راہوں پر قدم رکھنا توفیقِ الٰہی کے بغیر ممکن نہیں۔ دل کی زندگی کا تعلق اللہ نے اپنی ذات سے کر دیا ہے اور ظاہر ہے کہ خدا کی عنایت کسی طرح بھی انسان کے کسب، کوشش اور مجاہدے سے حاصل نہیں ہو سکتی وگرنہ تدبیرِ انسانی کے آگے خدا مغلوب شمار ہو۔ تب ہی تو مرضیٔ الٰہی سے عشق ایک بجلی کی طرح ہے کہ کس پر گرے کب گرے۔ یہ انسان کے بس سے باہر کی بات ہے اور عاشق کا یہ حال ہوتا ہے کہ بس ایک جلوہ ملا اور دیدار کی طلب آنکھوں میں اتر آئی۔ نہ تن کا ہوش رہا، نہ دنیا و مافیہا کا ایک ہی جھلک میں دین و دنیا سے آزاد ہوئے ''جذبۃ من جذبات الحق'' میں بس گئے۔ جمالِ ذات میں دیدۂ حیراں اٹھا لئے گئے۔ غالباً یہ اسعظیم امانت کو اٹھا لینے کا صلہ ہے جس سے کائنات کی ہر شے نے عاجزی ظاہر کی تھی جس کے لئے حق تعالیٰ نے اسے ظلوماً جہلولا کہا تھا۔ یہ بھی عجب بات ہے کہ خالی دامن ہو کر بھی عاشق نے محبوب کو چاہا۔ تب ہی غیرتِ حق اس کی تہی دامنی، اس کی یتیمی کو دیکھ کر جوش میں آئی۔ خصوصی انعام کے طور پر اسے خلوص عطا ہوا۔ یہ وفا وہ انعام ہے جو حق تعالیٰ ایسے بندوں کو عطا کرتا ہے جن کو وہ خود چاہتا ہے۔ عاشق سے محبوبیت میں لے لیتا ہے۔ یہ اس کی کامل سپردگی کا صلہ ہے۔ یہ اس کے کامل بے سہارا ہو جانے کی بات ہے۔

یہ بھی عجب بات ہے کہ بے سہارا ہو کر بھی عاشق کسی حالت میں بھی ہمت نہیں ہارتا۔ عشق کی راہ سے قدم نہیں ہٹاتا۔ یہ سرفروشی اس کی فطرت میں ودیعت ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ نصیبہ میں بربادی ہی بربادی ہے نہ وہ منہ موڑتا ہے، نہ منزل کی جانب چلتے رہنے سے کبھی رکتا ہے، نہ ہی قدم کو لغزش ہوتی ہے۔

اور یہ دیکھتے ہوئے بھی کہ ہزار بار آتشِ ہجر میں جلنے کے بعد بھی انجام وہی دوری ہے، وہی بے کلی، وہی بے قراری ہے، اس کی سرفروشی میں کبھی کمی نہیں ہوتی ۔ بلکہ اس راہ میں جو بھی تلواریں اس پر پڑتی ہیں وہ اس کی شدتِ شوق میں اور اضافے کا سبب بنتی ہیں۔ یہ حجاب در حجاب، پردہ در پردہ، اس کے لئے ہمیشہ جاذبِ نظر بھی رہتا ہے اور تازیانہ کا کام بھی دیتا ہے۔ اسے قرب اور دیدار کی تڑپ تو دائمی رہتی ہے لیکن نہ کبھی پردہ اٹھانیکی اسمیں تاب ہوتی ہے نہ کبھی حسن بے نقاب دیکھنے کی آرزو۔ حریمِ ناز ہمیشہ اس کے حدِ نظر رہتی ہے مگر حدِ ادب بھی اور پہنچ سے دور۔ اسے عشق کی جنوں سامانیوں کی جو بھی سزا ملتی رہتی ہے اس کو نہ صرف عطائے دوست سمجھتا ہے بلکہ صرف اپنے کو ہی اس کا مستحق گردانتا ہے۔ پس شدتِ جذب ومحویت میں اس پر محبوب کا ایسا تصور چھایا ہوتا ہے کہ نہ جنونِ شوق کا پتہ ہوتا ہے، نہ ہوش کا، نہ اپنا۔

گُم گشتہ در ذاتِ اُو اِنّا الیہ راجعون
من نیست باقی ہست اُواِنّاالیہ راجعون

بات عاشقوں کی ہو یا عارفوں کی، حق تعالیٰ نے دلوں کو زینت دینا اور محبوب بنانا، اپنی جانب منسوب کیا ہے۔ اور دامن بچاتے ہوئے، اپنی راہ پر لگے رہنے یعنی تقویٰ کو بھی اپنی جانب سے منسوب کیا ہے۔ اس لئے کسی نوعیت کے متقی کو تقویٰ کو اپنے اوپر لازم کر لینے کا اختیار نہیں اور اسی طرح عشق ومعرفت کی جو صلاحیتیں حق کی جانب سے دل کو عطاء ہوئی ہیں صرف ان ہی کی روشنی کے سہارے مقصود کے غم سے آسودگی یا قرب حاصل ہوسکتا ہے۔ اور صرف حال کی کیفیت میں، طلب، عجز، تڑپ، بے آرامی، پکار، دعا ہی سے محبوب کی جانب

راستہ پا سکتا ہے۔ اس حالت میں عقل کی ساری دلیلیں، ساری نا امیدیاں، سوائے وہم کے کچھ نہیں ہوتیں۔ عقل تو خودی اور گمراہی میں گرفتار ہے اس لئے عقل میں خدا کہاں آئے۔ البتہ دل چونکہ خدا کے نور سے اپنی نفی کر چکا ہوتا ہے اس لئے اسے راہ ملتی ہے۔ محبوب کا اثبات ہوتا ہے۔ صراطِ مستقیم پر کوئی گمراہ نہیں ہوتا۔ سالک پر جو گذرتی ہے اس کی بہتری ہے۔

در طریقت ہر چہ پیشِ سالک آئید خیر اُوست
در صراطِ مستقیم اے دل کسے گمراہ نیست

حافظؒ

عارف کا مقامِ قُرب

عارف کے لئے یہ مقامِ قُرب، دوسرے دلوں کو تحقیق عطا کرا کے ان کو سکون عطا کرنے کا وسیلہ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ لوگوں کے قلوب اس کی ذات میں حقائق الٰہیہ کو مثلِ آئینہ کے مشاہدہ کرتے ہیں، یا مثلِ نقش یا چھاپے کے کہ جنہوں نے اسے دیکھا انہوں نے حق دیکھا۔ اس یکتائیتِ محبوبیت میں شوق و عرفان کا تقاضہ ہوتا ہے کہ ہر ساعت عرشِ محبوب پر قیام ہو۔ کعبۂ شوق کے گرد طواف ہو۔ اس حال میں عارف کی تمام عالم سے نہ غیریت ہوتی ہے نہ دوری۔ عرش سے فرش تک کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں رہتی۔ ہر چیز منکشف ہو جاتی ہے۔ وہ جب محبت کی زیادتی کے باعث ذوق وشوق میں مستغرق رہتا ہے تو اس کی روح، دوست کی تجلّی کے نور سے اس منزل میں ہوتی ہے کہ دنیا کی کوئی مخلوق یاد نہیں آتی، سوائے محبوب کے چہرے کے کوئی چیز اس کے سامنے جلوہ گر نہیں ہوتی۔ اب اگر کیفیتِ حال میں اسرار میں کچھ راز اس سے ظاہر ہو جاتے ہیں تو

تقاضائے ادب کے تحت وہ پردہ پوشی کرتا ہے۔ یہاں تک کہ خود ایک راز، اپنے اور مالک کے درمیان ہو کر رہ جاتا ہے۔ اب سوائے خدا تعالیٰ کے کسی اور کو اس کے راز کا پتہ نہیں لگتا۔ اس حالت میں وہ اللہ کی کملی میں ہوتا ہے اور اس کو کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ کے۔

لہٰذا اب یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ بندے کو حقیقت کا علم اور حق کی معرفت، خدا کی ازلی رہنمائی اور اس کے مطلع کیے بغیر میسر نہیں آسکتی۔ اتنا ہی علم ہوتا ہے جو وہ عطا کرتا ہے۔ اسی لئے عارف بس ایک دائمی حیرت میں ہوتا ہے۔ کبھی بھی اپنی معرفت کا دعویٰ نہیں کرتا۔ ہمیشہ اپنی کم علمی کا اقرار کرتا ہے۔

گفت حافظؒ آشنایاں در مقامِ حیرت اند
دُور نبود گر نشیند خستہ و مسکین غریب

ایسے ہی عاشق کے پاس سوائے اپنی عاجزی کے کچھ نہیں ہوتا۔ اس کی عاجزی کی یہی نشانی ہے کہ عاجز کو یہ تک معلوم نہیں ہوتا کہ وہ عاجز ہے۔ تو جب عشق و معرفتِ الٰہی کی حقیقت کی کوئی انتہا نہ ہو، جب ان وسعتوں میں ایسے کھو جائیں کہ اپنی خبر نہ ہو تو یہی کہنا پڑتا ہے کہ نہ پہچانا حق تیرے پہچاننے کا۔ یہ ماعرفناک دائمی حیرت کا مقام ہے۔ اول اول جب علم الیقین میں حیرت طاری ہوتی ہے تو انا الحق پکار اٹھتا ہے پھر جب عین الیقین، حق الیقین میں حیرت طاری ہوتی ہے تو بارہ سال حضرتِ صابرؒ کی طرح دیدہ وا کھڑا رہ جاتا ہے۔ یہ حیرت وجود کی کیفیت کے بارے میں ہوتی ہے۔ کو وجودِ الٰہی پر یقین ہوتا ہے۔ مگر جب تمام اشیاء کے قیام کا دارومدار اس کی ذات پر ہے تو پھر حیرت یہ ہوتی ہے کہ میں کون ہوں کیا ہوں۔ لہٰذا جب ''مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ'' ہوا یعنی جب اپنے کو فنا کے ساتھ

پہچان ہوتی ہے، تب ہی اس کی مرضی میں راضی برضا ہوکر قیام ملتا ہے۔ عجز کا صحیح اعتراف ہوتا ہے۔ اسی لئے حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا: پاک ہے وہ ذات جس نے اپنی مخلوق کے لئے اپنی معرفت کی جانب اعترافِ عجز کی راہ کے سوا کوئی راہ نہ رکھی۔

راہِ تو چہ راہ است کہ از غایتِ تعظیم
دریائے محیطِ فلکش ہمچو حباب است
در بزمِ دل از روئے تو صد شمع برافروخت
ویں طرفہ کہ ہر روئے تو صد گونہ حجاب است

حافظؒ

آفاق میں دیکھیں تو تیری راہ بھی کیا راہ ہے کہ انتہائے تعظیم کے سبب سے تیرا لامحدود فلکِ بے کراں بھی مانند حباب ہو گیا ہے۔ ادھر نفس میں دیکھیں تو دل کی انجمن میں تیرے چہرے کی تجلّی سے اگر چہ سو شمعیں روشن ہیں لیکن طرفہ تماشہ یہ ہے کہ تیرا ہر چہرہ ہزار گنا حجاب بنا ہوا ہے۔

عشق و عبادت

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْن

''اور نہیں کی گئی تخلیق جن و انس سوائے اس لئے کہ عبادت کریں''

یہ اندازِ عبادت یُسَبِّحُ لَهٗ کے انداز میں ہے۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اس کی تسبیح میں ہے۔ اندازِ تسبیح جداگانہ ہے۔ کہیں ملکوتی شان ہے، پوشیدہ قوتوں کا اظہار ہے، کہیں نور، برق، حرارت، کشش کی صورت لئے ہے، کہیں ناسوتی صفات جلوہ نما ہیں، مادے اور اس کے خواص ہیں، جو بجائے خود

ایک طلسم کدہ حیرت بنے ہیں۔ اس سے ایک آگے ظہورِ حیات ہے۔ مادے اور قوت کے ارتباط سے زندگی جنم لیتی ہے۔ نچلی سطح پر نباتی اور حیوانی زندگی ہے۔ پھر انسان "اَحْسَنُ التَّقْوِیْم" ہے۔ جس کی زینت حواسِ خمسہ بنے ہیں۔ اسی کے لئے حیات و نور کی توحید سے عقل و عرفان ہے، قلب و وجدان ہے۔ روح، سرِ خفی، اخفاءِ غیب کی وارداتیں ہیں اور لطف یہ کہ حق تعالیٰ نے ساری تخلیق عالم کی ایک نفسِ واحدہ سے فرما دی۔ اس عجائب خانہ عالم کو طرح طرح کے انوار سے کچھ اس طرح مزین کر دیا کہ پتہ پتہ اس کے حکم کے بغیر حرکت نہیں کرتا۔ اس تمام ظہور در ظہور کے بعد بھی وہ ذاتِ پاک اسی طرح چھپا خزانہ رہی۔ غیب در غیب، حجاب در حجاب، لازمان، لامکان، نہ کمی نہ بیشی، اَلْآن کَما کَان

اول تخلیق کو قلم، عقل، عشق، نورِ محمدیؐ کے عنوان سے تعبیر دے کر باقی تخلیق کو اسی نور ظہور کی تفسیر عطاء فرمائی۔ ان صفات در صفات کی تصویروں میں یہی کچھ کہا جا سکا کہ

"رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا"

"اے ہمارے رب تو نے کوئی چیز باطل تخلیق نہیں کی"

مگر یہ شوقِ تخلیق کس لئے ہے۔ یہ "اَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَف" کی شدت ہے، نمود کی بے تابی ہے۔ اپنے پہچانے جانے کا شوق ہے اور یہ شوق اور بے تابی اس سطح کی ہے کہ اس پیکرِ وجود کے حصہ میں بھی آئی ہے جس میں اپنی روح پھونک دی، جسے اپنی صورت پر بنایا، جس کو شاہکارِ تخلیق، باعثِ کل تخلیق کہا۔ پھر اپنے افضل التخلیق کو ایسے مقام پر اٹھایا کہ ان کا ذکر آسمانوں اور زمین میں بلند ہو گیا۔ یہاں تک کہ خود اللہ اور ملائک ان پر درود بھیجتے ہیں اور مومنین و صالحین کو اس درود کی تلقین کر دی گئی ہے۔ اب اس ذکر کو عبادت کہہ لو یا عشق، تسبیح کہہ لو یا

درود، قدوسیت کہہ لو گیا سبحانیت، مگر ہے یہ سب کی سب نور اور حیات کی توحید، حی و قیوم کی تجلّی۔ اب اس کائناتِ عالم کے توحیدی درد کا اندازہ لگاؤ جس میں ذرہ سے لے کر آفتاب تک دانہ سے لے کر شجر تک، ادنیٰ حیوان سے لے کر احسن التقویم تک، ملائک سے لے کر مقربین تک، اس کی حمد و ثناء میں مشغول ہیں۔ اور وہ ان کی حفاظت سے نہیں تھکتا۔ اس کی رحمت سب کو محیط ہے۔ اے رب یہ سب تیرے لفظِ کُن کا ظہور ہے۔ تیری کن کن نعمتوں کو جھٹلایا جائے۔ تیری ہر روز نئی آن نئی شان، تُو ہی اول تُو ہی آخر، تُو ہی ظاہر تُو ہی باطن، سب کچھ فانی تُو ہی باقی ''لَا اِلٰہ اِلَّا ھُو''

یہ عالم، یہ حیات یہ وجود ایک احسان ہے کہ پیکرِ انسانی میں اپنے اسرار و رموز بھر کر اس کو بھی اس توحیدِ وجود سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیا، اَحْبَبْتُ کی بے قراری عطا کر کے، نفس، قلب، روح ہر سطح پر اس کو حقیقت کی جستجو میں لگا دیا اور اس کی ربوبیت کی۔ اس وجود اور زندگی کی لذتوں کا بذاتِ خود ہی کیا کم انعام تھا جو بے سبب عطاء کیا۔ رحیمیت، کہ ہماری جانب سے اس فرض کی ادائیگی کو بھی اور مزید انعامات سے نوازنا اپنے اوپر فرض کر لیا۔ جیسے خود بھیک دیں اور کہیں منگتے کا بھلا ہو۔ ہماری اس ادائیگی فرض تک کی عبادت کا نام جنت قرار دیا۔ اس عبادت کی ابتداء معبود کی تلاش سے ہوتی ہے یہ تجسّس براہیمی کا فطری جذبہ ہے کہ اپنی ربوبیت پر کامل بھروسہ، کامل تسلی، کامل تشفی دیدی گئی ہے۔ یہاں تک کہ لڑکپن میں اسی جذبہ تجسس کے تحت اس ربوبیت کے مرجع کی تلاش میں اور پھیلاؤ ہونے لگا۔ جوانی تک پہنچ کر، قوتِ ارادی کی مضبوطی میں خود اپنی آپ ربوبیت پر بھروسہ قائم ہونے لگا اور اگر قوتِ ارادی میں کمی ہوئی، حالات ناسازگار ہوئے تو اپنے خیال ربوبیت کے پیکروں کی جانب رجوع ہونے لگے۔ کبھی یہ رب کبھی وہ

رب، اگر ان ہی عارضی اور فانی سہاروں پر تکیہ کر لیا یا اپنے کو عضو ناکارہ سمجھ بیٹھے، تو سب ہمت، حوصلے ختم کر کے زندگی کو ایک مردہ جسم یا جانور کی سطح پر گذار کر اختتام تک پہنچا دیا۔

مگر جن کے قلوب میں ایک فطری ہیجان ہے ان کے قلوب کو کب ان جھوٹے مظاہرِ ربوبیت سے تشفی مل سکتی ہے۔ وہی تو ہیں جو محویت جذب وشوق، جوش وولولے میں، ایک آرزو لئے اپنے رب کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جن کی عقل و دانش نے مالکِ حقیقی کی شناخت کے سامان پہنچائے۔ کبھی ہادیانِ عالم نے ان کی رہنمائی کی، کبھی پیامِ باری تعالیٰ ان کی تسکین دل بن کر سامنے آیا۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے ہادی کی سچائی پر بھروسہ کر کے اس کے ذریعے پہنچنے والے پیامِ باری کے احسان میں دب جاتے ہیں۔ ان کے لئے کسی شمسِ تبریزی جیسے کا دامن ہاتھ آجائے تو وہ ذات حق خود راستہ کھولتی ہے۔ جب شمسِ تبریزی خود دل میں بس گئے، قلب کا آئینہ زنگ اور آلائشوں سے صاف ہوا، شمسِ تبریزی کی یاد میں خود شمس ہو گئے تو یہی قلب اب اس نورِ حق کی تابانی دینے لگا، یہی جسمِ خاکی اب عشق کی مستیوں میں افلاک میں پھیلا۔ پھر جب تجریدی رنگ میں آئے تو معلوم ہوا کہ عشق اور حسن دونوں ہی اس حق کی تابانی ہیں۔ اسی تجریدی لطافت میں ہر جگہ حسنِ رخسارِ حق پایا۔ جدھر رخ کیا وَجْهُ رَبِّی کی تجلّی ملی۔ ایسوں کے لئے بندے اور رب کا وہ رشتہ جو یومِ ازل قائم ہوا اس دنیا کے گھورکھ دھندے میں ہوتے ہوئے بھی استوار ہو گیا۔ یہ وہ ہیں جنہیں عکسِ رخسار میں، مجردات عالم میں، رویتِ باری نصیب ہوئی۔ تب ہی وہ

"اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا

وَمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ"

پکار اٹھتے ہیں۔ اپنا چہرہ اس وَجْہُ رَبِّی کی جانب کر لیتے ہیں۔ جس نے آسمان و زمین پیدا کئے۔ ان کا مسلک ہے کہ

ہر چہ آید درنظر غیرِ تو نیست
یا توئی! یا بوئے تو یا خوئے تو

یہ توحید کا وہ خاص رنگ ہے جس میں ذات کے علاوہ کوئی دوسرا تخیل نہ ہو۔ یہ ابراہیمی انداز ہے۔ یہ اَنِّی وَجَّہْتُ ذہن وفکر کی یک رُخی ہے۔ قوائے روحانی میں اس محبت کا جڑ پکڑ لینا ہے اور اثر پیدا ہونا ہے جس کے ادنیٰ نتیجہ میں جملہ اعضاء محبوب سے پُر اور اغیار سے خالی ہوتے ہیں۔ گویا یہ وَجْہُہ جمیع ماسوا سے لاتعلق ہو کر حق تعالیٰ کی جانب متوجہ ہو جانا ہے۔ ان کا تقویٰ بھی یہی ہے کہ ہر اس چیز سے نفرت، بے زاری اور کنارہ کشی ہے جو دل میں متعین ہو کہ واصل باللہ ہونے سے مانع ہو۔

وجودِ انسانی میں تمام صفات کی توحید ہے۔ اپنے اندر تمام صفات کی میزان سے محرک سکون ہے۔ اسی توازن سے ہی فروغِ عمل ہے۔ اسی یک رخی میں ہر شے، ہر ارادے، ہر عمل کے پیچھے رب کی کارفرمائی دیکھنا ہے۔ یہی ابراہیمی خصوصیت ہے۔ یہ خود اپنی صلاحیتوں کی یک رخی اور فطرت سے ہم آہنگی میں توحید کو پا جانا ہے۔ اسلام کی پہلی منزل، بنیادِ دین یہی ہے۔ تجسسِ ابراہیمی، جذبِ ابراہیمی، وفائے ابراہیمی، خلّتِ ابراہیمی، نارِ ابراہیمی کی شدتوں میں تعینات کے بت مسمار کر کے مجرداتِ حق تک پہنچنا یہی ہے۔ بت کیا ہے؟ غیر ذی روح مجسم خواہ پتھر کا بت ہو، ہو او ہوس کا، طلبِ دنیا، حب جاہ ہو، یا جو چیز بھی

ماسوٰی اللہ میں شمار ہو کہ جس میں اُلجھ کر بندے اور حق تعالیٰ کے درمیان حجاب آجائے وہ بت ہے۔ اب خواہ وہ سیرت ہو یا صورت، خیال ہو یا عمل عادت ہو یا رسم، ان سب میں انہماک بت پرستی ہی کہلائے گا۔ اور سب سے بڑا بت تو اپنی 'مَیں' کا ہے۔ اس کے تحت خواہشاتِ نفسانی ہی کیا اکثر علم وفضل یا رسمی عبادت بھی حجاب بن جاتی ہے۔ اسی طرح یہ کائنات کے جملہ مظاہر بت ہیں کیونکہ اگر خلق کی ظاہری صورت کو دیکھا لیکن حق کو جو اس میں پنہاں ہے نہ دیکھا تو یہ بھی کفر ہے۔ یا خالق کو اسماء وصفات کے ساتھ نہ پہچانا بلکہ اپنی عقل سے کوئی خاص صورت متقرر کر لی تو وہ اعتقادی صورت بھی بت ہے۔ اس طرح بت پرستِ مجازی کی نظر حقیقتِ بت پر نہیں ہوتی، بلکہ اس تعین میں محدود رہتی ہے۔ اس لئے شریعت کے نزدیک وہ کافر ہے۔ اور جب حق کو بھول کر اپنی دانائیوں اور قوتوں پر ہی بھروسہ کرتا ہے یا بت کو اس کی حقیقت کے لحاظ سے غیر اللہ جانتا ہے تو وہ مشرک ہے۔ جب تک اس شرک اور کفر سے نہ نکلے مجردات حق تک کیسے پہنچے ''فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' کا کیف کیسے ملے۔

اس کیف ہی میں، کائناتِ عالم میں، توحیدِ ذاتی کی اثر پذیری اور تخلیق کی ایکائی حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح ہی راستی، استقامت اور یک رخی نصیب ہو کر حنیف کہلاتے ہے۔ یہ توحیدِ تخلیق میں قدم رکھنا قیام کی بات ہوتی ہے۔ قائم الصلوٰۃ ہو جانے کی بات ہوتی ہے اور اس کی تصدیق میں مصلائے براہیمی پر نماز ادا کرنے کے حقدار ہوا کرتے ہیں۔ اب کہیں عبادت کا بھی لطف آتا ہے کہ جدھر رخ کیا وَجْهُ اللهِ کے انوار دیکھے ''فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللهِ'' یہی بات ہے وہ انوار، وہ شام کی قسم وہ ڈھلتے اندھیرے کی قسم، وہ چاند سورج ستاروں کی قسم، اس نور کے ڈورے کی قسم جو پروانے اور شمع میں ہے، اس حسن وعشق کے تعلق کی

قسم جو پتے میں ہے، بلبل میں ہے، مجھ میں اور محبوب میں ہے، اس انبساط کی قسم جو گلشن میں ہے، کائنات میں ہے۔ وہ انبساط ہی انبساط، وہ انبساط کہ وجود پھٹ جائے۔ مگر وہ غمِ عشق، وہ شمع کا سوز کہ جو اس امانت کا بوجھ برداشت کر سکے۔ وہ غم جو سب کو آغوش میں لے لے، کثرت میں وحدت، وحدت میں کثرت۔ یہ عکسِ رخسار کی تجلّی ہے۔ پردۂ کثرت چہرۂ وحدت۔ یہ وجہہ اللہ روپ کی چھب ہے، جس نے میرے ظاہر باطن کو اپنی وحدت میں ڈھانپ لیا ہے۔ یہ مجردات کی دنیا ہے۔ ان مجرادتِ فطرت کے انوار میں خود کیا آئے کہ یہ جسم بھی لطیف ہوا۔ نفس، قلب، روح ایک ہی توحید میں ہوئے۔ اب اپنے میں سے حنیف کی تجلّی (راستی اور استقامت) نشر کرنے لگے۔ یہ نفسِ مطمئنہ کی منزل ہے۔ نفسِ مطمئنہ ہی میں ڈیرے ڈال دیئے تو جنتوں میں داخل ہوئے، خلعت کا جامہ پہنا۔ اپنے رب کے انعام و اکرام سے جسمانی، روحانی سب ہی غذاؤں سے سیراب ہوئے۔ اب کہیں ماں باپ کے پیچھے بھی وہی پالنے والا ہاتھ نظر آیا جس نے سمٰوات اور ارض پیدا کئے۔ جھانک کر دیکھا تو لوگوں کے تخیل کے مصنوعی بتوں کے پیچھے بھی اسی رب کریم کی ربوبیت نظر آئی۔ مگر ان وہم پرستوں کے شرک سے بے زار ہوئے۔ ''وَمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْن'' پکار اٹھے۔ اے رب اگر تو نے رہنمائی نہ کی تو میں گمراہ ہو جاؤں گا۔ اے رب میں تیرے سہارے کے بغیر دوسرا سہارا نہیں مانگتا (جبرائیل کا بھی نہیں) اب کہیں ''عَرَفْتُ رَبِّیْ بِرَبِّی'' کے مصداق ہوئے۔ رب کو اپنے میں، اپنے رب سے پہچانا۔ اب کہیں ذات کو ذات سے اپنانے کے قابل ہوئے گویا عشق انفرادی کی منزل سے چل کر وجود کی لا، کی، تجریدی عشق میں پھیلے۔ صفات کی بھی لا کی، تب ہی کہیں حقیقت ذات تک رسائی ہوئی۔ اب کہیں ''کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ'' کا کیف اپنایا۔ ہر شی کی لا ہوئی تب

ہی اللہ کی روح، روح القدس کا نشان ملا۔ ایک روح مخلوق تھی جس کی وجہ سے اس چیز کی صورت کو قیام تھا۔ صورت کے لئے روح ایسی ہی تھی جیسے کہ لفظ کے لئے معنی۔ پھر روح مخلوق کے اپنے قیام کے لئے یہ روح القدس ''وَجہُ رَبِّیْ'' تھی جسے وجود سادی کہہ لیں کہ ہر روح مخلوق میں جاری و ساری ہے اور مخلوق اور روح القدس کے درمیان بطور برزخ ایک اور روح کی جلوہ گری بھی ضروری تھی، جسے روحِ انسانی روحِ ملکوتی یا روح الروح کہہ لیں۔ مگر ہر شے کو فنا ہے سوائے اس کی وجہہ آئینہ کے۔ جسم مادی مع اپنی تمام رعنائیوں کے ہی کیا، روحِ مخلوق، روحِ انسانی ہی کیا۔ بقا ہے تو صرف وَجہُ ربی کو یہ وجہ ہی تمام تخلیقِ وجود کے حسن کا سبب ہے۔ ہر مادی شے کے پیچھے اسی حقیقت کی تابانی ہے۔ اسے عشق و حیات کے تعلق میں دیکھو، اپنی اور اس کی ذات کی وحدت میں دیکھو، انائے جزوی اور انائے مطلق کے وصال میں دیکھو۔ وہ عالم ہُو۔ وہ گم شُد اندر گم شُدن۔ یہ وحدت الوجود ایک ہی وجود ہے جو بطون سے ظاہر میں اپنی اور اس کی ذات کی وحدت میں دیکھو۔ انائے جزوی اور انائے مطلق کے وصال میں دیکھو آیا ہائے کثرت میں نمایاں ہوا۔ اس ظہور اور بطون میں نہ کل و جزو کا تعلق ہے نہ ظروف و مظروف کا بلکہ وہ تعلق ہے جو چہرہ کو آئینہ میں عکس کے ساتھ ہوتا ہے۔ یعنی صل چہرہ کو تو باطن سمجھیں اور آئینہ میں جو اس کا رنگا رنگ ظہور ہے اس کو ظاہر۔ یہ کثرت میں وحدت ہے، وحدت میں کثرت۔ یہ عکسِ رخسار کی تجلی ہے۔ پردۂ کثرت چہرۂ وحدت، یہ وجہہ اللہ کا روپ ہے۔ یہ حق موجود محمدؐ صورت ہے۔ اس نور کے دھارے، اس حقیقتِ محمدیؐ کے کیف میں ہی وحدت الوجود کی لذت ہے، انسانیت کی معراج ہے۔

دیکھا جائے تو اپنے عروج میں یہ اشرف المخلوقات، فنا کی منازل طے

کرتا ہوا، جمادی، نباتی، حیوانی منازل سے گذر کر مقامِ انسان تک آیا۔ پھر عشق ذات میں فنا در فنا کی منازل طے کر کے، اسماء وصفات سے فنا ہو کر

من ز جاں فانی بہ جانا لا بقیم

تک پہنچا۔ یہاں صرف وَجهه ربی کو بقا تھی۔ بقا کے کرم و انعام کا حسین نکتہ ''فبای الاء ربکما تکذبان'' کی صورت میں ارشاد ہوا۔ اِتمامِ نعمت ہوا۔ ''ذو الجلال والاکرام'' نے وجہہ تجلّی کا انداز اپنے محبوب کو عطا کر دیا۔

صدیاں بیت گئیں۔ خدا کے پرستار بھی آئے۔ ہادیانِ دین بھی آتے رہے۔ زمانہ بار بار روشنی میں آ کر پھر تاریکیوں میں جاتا رہا۔ شریعت وعبادات کا بھی سختی سے دور دورہ رہا۔ عشق ومحبت کی داستانیں بھی زمانے کو سنائی جاتی رہیں۔ تب کہیں وہ زمانہ آیا کہ لوگوں نے عبادت کو یار کے انداز سے اپنانا سیکھا۔ عبادت اس لئے کی کہ یار کو پسند تھی۔ نماز کو یار نے آنکھوں کی ٹھنڈک بتایا تھا۔ معراج المومنین فرمایا تھا۔ تب ہی کہیں جا کر یہ راز کھلا کہ عبادت کیا ہے۔ ایک حضوری ہے، ایک نسبت قائم کرنا ہے۔ اب کہیں ان عبادت گذاروں کو موانست اور ہم جلیسی میں، جیتے جی جنت کی زندگی نصیب ہوئی۔ اصل جنت تو قلب وروح کی سطح پر تھی۔ وہ اخوۃ ومحبت کی دنیا، انس وتعلق کی دنیا، ''وَاعْتَصِمُوْ بِحَبْلِ اللهِ'' کی دنیا۔ اب کہیں انسان صحیح معنوں میں شکرانۂ بندگی ادا کرنے کے قابل ہوا۔ اب کہیں رحمت وربوبیت کی ہر جانب فراوانی میں، ماں کے پاؤں تلے جنت نظر آئی۔ اب کہیں مرشدِ حقیقی کے احسانِ ربوبیت کو سمجھنے کا موقع ملا هَلْ جَزَاءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَان۔ سر پائے ساقی پر سجدہ ریز ہوا۔ یہ عابد کی جنت ہے۔ عشق کیا ہے۔ اپنے آپ سے خود فراموش ہو جانا۔ عشق کی منتہا تو دیدار

ہے۔ دو نیناں مت کھائیو پیا ملن کی آس۔ یہ آنکھوں کی پیاس تو کبھی نہیں بجھتی۔ عشق تو اَحْبَبْتُ کی شدت شوق ہے۔ اس میں نہ سکون ہے نہ قرار، نہ منزل ہے نہ مقام، عاشق کے لئے کیا ہجر کیا وصال، دونوں ہی نار حریق بھڑکتی آگ۔ عاشق کے کے لئے ہجر میں سوائے بل بل کر مرنے کے اور پھر جی جی کر جلنے کے اور کیا ہے۔ اس کے لئے تو قسمت سے کبھی آمنا سامنا بھی ہوا تو اور دو گونہ عذاب خشیتِ حسن سے آنکھ اٹھانے کی مجال کہاں۔ دیدار کی تاب کون لائے۔ کوہِ طور بھی بل جاتا ہے۔ ہاں مقامِ حیرت میں اگر آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں تو صابر کے لقب سے نواز دیئے گئے۔ یکتا ہوئے۔ جلالتِ حسن کی تجلی میں سوائے یار کے اور کچھ نہ رہا۔ بھیک اور مالی ایک ہوئے۔

بھیکا کھوبھرم دوئی کا، ہو یکتا، مورے صابر پی کی ریت یہی
بھیک مالی بھنے، مالی بھیک بھنے، ناران ہرے، ناران ہرے

اب اگر مقام جبروت میں آئے، جباریت نے آغوش میں لیا، تب بھی کیسے ہوش وحواس سر قدموں میں دیدیا، نعلینِ مبارک تک رسائی ہوئی۔ رحمت بے کراں نے پھر بھی محبوبیت کے مقام پر اٹھالیا، پردہ کا پردہ رہا، محبوبِ الٰہی کہلائے۔

من مورا بھیا تن پہیم کا، اب شغل میں نور کپور بھیو
ھم گر مالی کے سرن پڑے، ناران ہرے، ناران ہرے

اب صابرؒ نظامؒ دونوں گنج شکرؒ کے لال ہوئے۔ جلال اور جمال دونوں صاحب کمال ہوئے۔ عشق کی یہ دونوں معراجیں دیکھ کر اب کہیں عشق وعبادت کا موازنہ ہو سکا۔ عابد کی خلقت نے تحسین کی۔ اس نے آسمان کی جانب ہاتھ اٹھا دیئے۔

''رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنیَا حَسَنَۃً وَفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃ''

''اے رب ہمیں دنیا میں اور آخرت میں حسنات سے نواز''

عاشق کے گرد خلقت لپٹتی رہی، مگر وہ اپنا راستہ صاف کرتا، زمین کی جانب گردن جھکائے پکارتا چلا

جَاءَ الْحَقُّ وَزَھَقَ الْبَاطِلُ. اِنَّ االْبَاطِلَ کَانَ زَھُوقًا

حق آیا اور باطل رفع ہوا　　الحق نبی کریمؐ کی ذات مبارک

روشنی آئی، تاریکی گئی　　غیب سے صدائے بازگشت آئی

عارفوں نے دیکھا کہ ''عشق کا منتہا دیدار ہے۔ عبادت کا انعام جنت ہے'' محرموں نے جانا کہ ''عشق کیا ہے اپنے آپ سے خودفراموش ہو جانا۔ عبادت کیا ہے یار کو یار کے انداز سے اپنانا''

❁❁❁❁